آہ! بیچارہ "دو قومی نظریّہ"

(کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو)

پرویزؔ

زندہ قومیں، ان اساسات کی جو اُن کی مملکت یا قومیت کی بنیاد ہوتی ہیں بڑی شدت اور حمیت سے حفاظت کرتی ہیں۔ اور کسی ایسی حرکت یا جنبش کو نہ روا رکھ سکتی ہیں نہ برداشت کر سکتیں جو اس میں ذرا سا بھی تزلزل پیدا کرنے کا موجب ہو۔ اس کے برعکس جن قوموں کے دل میں اپنی مملکت یا آزادی کی اہمیّت نہیں رہتی اُن میں ان اساسات کے خلاف دساوس انگیزیاں اور تشکیک طرازیاں معمول بن جاتی ہیں جن سے رفتہ رفتہ اُس مملکت کی عمارت ہی ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ بدقسمتی سے مملکتِ پاکستانیہ شروع ہی سے اس قسم کی وسوسہ انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کی آماجگاہ بنے چلی آ رہی ہے۔

مطالبۂ پاکستان کی اساس و بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ اسلام کی رُو سے قومیت کی تشکیل اشتراکِ وطن کی بنیادوں پر نہیں ہوتی۔ ایمان کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، ہندوستان میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم نہیں۔ یہاں کے مسلمان اپنے دین کی بنا پر غیر مسلموں سے الگ ایک قوم ہیں، اس لئے ایک جداگانہ آزاد مملکت کے دعویدار۔ ہندوستان میں اس نظریہ اور دعوے کی مخالفت ہوئی —— ہندوؤں کی طرف سے بھی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے بھی۔ اور ہم (تحریکِ پاکستان کے مؤیدین) نے اِن کے ہر اعتراض کا جواب دیا۔ بتوفیقِ ایزدی ہمیں کامیابی ہوئی اور اس طرح مملکتِ پاکستان وجود میں آ گئی۔

اس خطۂ زمین میں پہلے سے بھی کچھ لوگ بستے تھے اور اس کی تشکیل کے بعد کثیر تعداد میں لوگ دوسرے مقامات سے منتقل ہو کر یہاں آ بسے۔ اوّل الذکر زمرہ کے لوگ ہوں یا ثانی الذکر گروہ کے، ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس مملکت کو اپنا نشیمن بنایا ان کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی تھی (اور بجا طور پر کی جانی چاہیئے تھی) کہ وہ اس مملکت کی اساس و بنیاد سے متفق ہیں اور اس کے محافظ اور امین۔ لیکن بعد میں رونما ہونے والے حالات نے اس حسنِ ظن اور نیک توقع کی تردید کر دی اور دیکھا یہ گیا کہ یہاں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو نہ صرف اس کی اساس پر یقین نہیں رکھتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ دساوس انگیزیوں سے اس کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا جائے۔ ایمان کے اشتراک کی بنا پر مسلمانوں کی الگ

قومیت کے نظریہ کے خلاف (جسے مختصر الفاظ میں "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے) یہاں جو لب کشائی بھی ہوگی وہ ان کی اسی سعیٔ نامراد کی غماز ہوگی۔

میں تحریکِ پاکستان کے دوران بھی اس قسم کے اعتراضات کا جواب دیتا رہا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی۔ اس لئے کہ "دو قومی نظریہ" میرا سیاسی مقصد ہی نہیں میرے ایمان کا جزو ہے۔ حال ہی میں اس موضوع پر میرا مبسوط اور قرآنی اسناد سے بھرپور مقالہ (طلوعِ اسلام۔ بابت جنوری ۱۹۸۱ء اور نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۷ر نومبر ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا تھا جسے ملک کے اربابِ دانش و بینش نے بنظرِ تحسین دیکھا۔ وہ مقالہ ایسا مبسوط اور مدلّل تھا کہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے بعد اس نظریہ کے خلاف کوئی کچھ نہیں لکھے گا۔ لیکن مخالفت کرنے والوں کو کون روک سکتا ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ "دو قومی نظریہ اور اسلامی نظریہ کی جامعیت" کے عنوان سے محترم فتح نصیب چوہدری کے قلم سے ایک طویل مقالہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۲ر اور ۱۳ر اپریل میں دو قسطوں میں شائع ہوا اور آخر میں "جاری ہے" لکھا ہے۔ یہ مقالہ کچھ ایسا پیش افتادہ تھا اور صاحبِ مقالہ کی قرآنِ کریم کی تعلیم سے ناواقفیت کا آئینہ دار ہے کہ میں اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتا۔ لیکن مقالہ نگار کے نام کے ساتھ "شعبہ سیاسیات پنجاب یونیورسٹی" کا لاحقہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صاحب کے خیالات ان کی ذات تک محدود نہیں۔ اُستاد ہونے کی جہت سے اس سے ان کے طلباء کے (ناپختہ) ذہنوں کے متاثر ہو جانے کا بھی خدشہ ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں اصل حقیقت کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ خود مسلمانوں کی طرف سے اسلام کے خلاف اعتراضات کی جوابدہی شاید میری زندگی کا مقدّر بن چکی ہے۔ ٹھیک ہے ع

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

(۱)

مقالہ نگار آغازِ کلام اس طرح کرتے ہیں:-

برِّصغیرِ ہند کی تقسیم جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا، کے متعلق ہم سب جانتے ہیں کہ قائدِاعظمؒ کے مشہور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر عمل میں آئی تھی۔ لیکن یہ دو قومی نظریہ کیا تھا۔ اس کی نظریاتی اور عملی بنیادیں کیا تھیں۔ قائدِ اعظمؒ نے کن اصول دلائل کے حوالے سے اپنے اس نظریہ کو پیش کیا تھا۔ برِصغیر کی بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے ان سب سوالات کے جوابات کا ہم میں سے بیشتر کو صحیح طور پر علم نہیں۔ اس سلسلہ میں ہم عام طور پر اور ہمارے لکھنے والے خاص طور پر جو مؤقف اختیار کرتے ہیں اسے اگر مختصراً بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار چونکہ نسلی اور وطنی رشتے نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریۂ حیات ہے۔ اس لئے مسلمانانِ برِصغیر یہاں کے ہندوؤں اور دوسرے باشندوں سے جداگانہ نظریۂ حیات کے پیروکار ہونے کے ناتے ایک الگ قوم قرار پاتے ہیں۔ لیکن یہ مؤقف علمی

اور عملی حقائق کے حوالے سے اتنا کمزور اور غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس سے ہم ان تمام اعتراضات کا جواب نہیں دے سکتے جو وقتاً فوقتاً اٹھائے جاتے رہے ہیں یا اٹھائے جا رہے ہیں۔

آگے چل کر وہ ان الفاظ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام، قومیت کا معیار نسل یا وطن کو نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریۂ حیات کو قرار دیتا ہے۔ قرآن کی رو سے غلط ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا ہم مسلمان اسلامی نظریۂ حیات میں اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم نہیں۔

اس کے بعد قائداعظمؒ کی باری آتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

قائداعظمؒ نے یہ تاریخی معرکۂ دو قومی نظریہ کو اس انداز سے پیش کر کے نہیں جیسا تھا جس انداز میں ہم آج اسے پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہمارا قومیت کا معیار صرف اور صرف مذہب ہے اس لئے ہم مسلمان برِصغیر کے دوسرے باشندوں سے الگ ایک جداگانہ قوم ہیں۔ بلکہ انہوں نے برِصغیر کے مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کا نظریہ ان تمام حقائق و عوامل کی بنا پر پیش کیا تھا جو قومیت کے حقیقی معیار پر پورے اترتے ہیں اور جنہیں قومیت کی تشکیل کے ضمن میں علمی اور عملی سطح پر بھی مسلّمہ سمجھا جاتا ہے۔

مذہب کو بنائے قومیت قرار دینے کے خلاف جو اعتراضات ابھرتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ مسٹر گاندھی نے ۱۹۳۹ء میں یہ اعتراض کیا تھا کہ

ممکن ہے یہ دعویٰ کہ ہند میں مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں قابلِ بحث ہو لیکن یہ تو میں نے کبھی نہیں سنا کہ دنیا میں اتنی ہی قومیں ہیں جتنے کہ مذاہب۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ "انگریز"، "مصری"، "امریکی"، "جاپانی" وغیرہ تو جداگانہ قومیں نہیں لیکن مسلمان، ہندو، پارسی، عیسائی، یہودی وغیرہ جداگانہ قومیں ہیں۔ خواہ وہ کہیں پیدا ہوئے ہوں۔

یہ مسٹر گاندھی کا اعتراض تھا اس پر ہمارے یہ معلّم سیاسیات اضافہ فرماتے ہیں کہ

اس سلسلہ میں ایک بنیادی سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ محض مذہب یا نظریۂ حیات کو ہی اگر قومیت کا معیار مان لیا جائے تو یورپ امریکہ اور افریقہ کی ان بہت سی اقوام کا کیا جواز بنتا ہے جو کہ ایک ہی مذہب یا نظریۂ حیات یعنی عیسائیت کی علمبردار ہیں۔ اسی طرح ایرانی، "مصری"، "شامی"، "عراقی"، "فلسطینی" اور "انڈونیشی" اقوام کا کیا جواز مہیا کیا جائے گا جبکہ وہ ایک ہی نظریۂ حیات یعنی اسلام کے پیروکار ہیں .... سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر برِصغیر کے مسلمان محض اسلامی نظریۂ حیات کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم قرار پاتے ہیں تو پھر ایران، افغانستان اور دیگر ممالک کے مسلمانوں سے ان کی جداگانہ قومیت کا کیا جواز ہے۔

یہاں تک مقالہ نگار نے یہ کہا ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام کی رو سے قومیت کی بنیاد مذہب کا

اشتراک ہے۔ اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ پھر قومیت کا معیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قوم صرف اور محض نظریاتی اشتراک یا مذہبی اتحاد کی بنا پر وجود میں آنے والی انسانی جمعیت کا نام نہیں بلکہ انسانوں کے ایک ایسے اجتماع کا نام ہے جو ثقافتی اتحاد کی تمام معروف قدروں کی بنیاد پر وجود میں آیا ہو۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

اسلام میں بھی قومیت کا معیار نظریۂ حیات نہیں بلکہ نسلی اور ثقافتی یکسانیت ہی ہے۔ اور قرآن کی رو سے قوم ایسے ہی گروہ کو کہا جائے گا جو نظریۂ حیات کی بنا پر نہیں بلکہ ثقافتی یکسانیت کی بنا پر وجود میں آیا ہو۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام قومیت کا معیار نسل یا وطن کو نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریۂ حیات کو قرار دیتا ہے قرآن کی رو سے غلط ٹھہرتا ہے۔

اور مقطع کے بند میں بالکل کھل کر سامنے آجاتے ہیں، جب کہتے ہیں:۔

نسلی یکسانیت، لسانی وحدت، مذہبی اشتراک اور جغرافیائی وحدت سب کی سب اگرچہ کسی گروہ میں مشترک ثقافتی ورثہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر ان میں قومیت کے اعتبار سے جغرافیائی وحدت سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اور آن کی آخری دلیل یہ ہے کہ

ہمارے علمی حلقوں میں جو یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اسلام کے پیروکار ہونے کے ناتے ہم مسلمان ایک قوم ہیں یا یہ کہ اسلام کا قومیت کا معیار نسلی یا ثقافتی رشتے نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریۂ حیات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم قوم اور ملت یا اُمت کی اصطلاحوں کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ دونوں اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ (اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اشتراکِ مذہب کی بنا پر مسلمان ایک اُمت قرار پائیں گے۔ ایک قوم نہیں۔ قرآن نے انہیں قوم نہیں، اُمت ہی کہا ہے۔ اس لئے) "مسلمان کو ایک قوم نہیں، مسلمان کو ایک اُمت یا اُمتِ اسلامیہ کہا جائے گا۔ جہاں تک ان کی قومیت کا تعلق ہے تو وہ اُسی نسل یا ثقافتی ورثہ کے حوالے سے متعین ہوگی جس سے اُن کا نسلی یا ثقافتی تعلق ہوگا۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ چوہدری فتح نصیب صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ

(۱) اسلام میں تقسیم انسانیت کی بنیاد مذہب نہیں۔

(۲) قائدِ اعظمؒ نے بھی مسٹر گاندھی اور دیگر نیشنلسٹ لیڈروں کے اعتراضات کے جواب میں) صرف مذہب کو وجہ اجامعیت قرار نہیں دیا تھا۔

(۳) اگر مذہب کو بناءِ قومیت قرار دے دیا جائے تو دنیا کی سینکڑوں قوموں کے متعلق کیا کہا جائیگا۔

(۴) تشکیل قومیت کی بنیاد ثقافتی، نسل یا جغرافیائی وحدت ہے۔

(۵) قرآن میں مسلمانوں کے لئے "اُمّت" کا لفظ آیا ہے، قوم کا نہیں۔

آیئے ان دعاوی کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ یہ کس قدر مغالطہ آفرینی پر مبنی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ اعتراضات نئے نہیں۔ یہ سب، تحریکِ پاکستان کے دوران مخالفین کی طرف سے اٹھائے جاتے تھے۔ اور طلوعِ اسلام میں ان کا تفصیلی جواب ساتھ کے ساتھ دیا جاتا تھا۔ (تفصیل کے لئے میں قارئین کی توجہ اپنے اس مقالہ کی طرف مبذول کراؤں گا جو "دو قومی نظریہ" کے عنوان سے نوائے وقت کی ۲۱ نومبر سنہ ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے) اب یہ دیکھئے کہ اسلام کی رُو سے صحیح پوزیشن کیا ہے۔

(۰)

(۱) قرآنِ کریم کی رُو سے بناءِ تقسیم

قرآنِ کریم میں ہے:-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ ..... (۶۴/۲)

"خدا نے تمہیں (تمام انسانوں کو) پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور ایک گروہ مومنین کا۔

سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانوں میں جو تفریق و تقسیم کی ہے اس کی بنیاد خالص مذہب (کفر و ایمان) ہے یا اس کے ساتھ، یا اس سے الگ، کوئی اور عنصر بھی؟ قرآن نے وجہِ تقسیم صرف اور صرف کفر و ایمان کو قرار دیا ہے۔

کفر اور ایمان کی بنا پر دو الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہو جانے والے انسانوں کے باہمی تعلقات کو قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ حیات میں (جسے اُس نے اسوۂ حسنہ۔ بہترین نمونہ قرار دیا ہے) تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انہوں نے (ایمان میں مشترک نہ ہونے والے) اپنے باپ اور پوری کی پوری قوم سے برملا کہہ دیا کہ

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ .... (۱۹/۴۸)

میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ:-

إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ز

ہم تم سے اور اُن سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو، ان سب سے بے تعلق ہیں۔

كَفَرْنَا بِكُمْ۔ "ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔" وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا ...... "تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔" اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت

ہے" اور یہ نفرت، رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر ایمان لے آؤ جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے، حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗٓ ...... (۶۰/۴)" اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶)" جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے" اور میرے اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہوں" وہ میرے غیر ہیں۔

غور کیجئے، حضرت ابراہیمؑ کی یہ قوم نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، ہر لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مشترک تھی۔ ان اشتراکات کے باوجود وہ کونسا عنصر تھا جس نے اُن میں ایسی گہری تفریق پیدا کر دی - ایمان (مذہب) اور صرف ایمان۔ چنانچہ انہوں نے اُن سے واضح طور پر کہہ دیا کہ تم اور ہم اُسی صورت میں ایک ہو سکتے ہیں جب تم ایمان میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

حضور نبی اکرمؐ کے عہدِ رسالت میں کفر اور ایمان کی تفریق کی بنا پر جو دو گروہ وجود میں آئے وہ بھی نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، حتیٰ کہ رشتہ داری کی بنا پر مشترک تھے۔ اس تفریق کے بعد ان دونوں گروہوں کے متعلق واضح الفاظ میں فرمادیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ...... (۹/۷۱) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں"۔ اور اُن کے مقابلہ میں، نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم: بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ...... (۸/۷۳) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز"۔ اس کے بعد اس قومِ مومنین کو تاکید کر دی کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ ......

اے جماعتِ مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔

اس لئے کہ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ...... یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ...... ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں اُلجھے رہو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ...... ان کی بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ اُن کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۳/۱۱۸) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے)۔

آپ نے غور فرمایا کہ اختلافِ مذہب (کفر و ایمان) کی بنا پر جو تفریق واضح ہوتی ہے اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ ایمان کے اشتراک کی بنا پر یکجا ہونے والے افراد کو وہ صرف ایک گروہ کے افراد نہیں کہتا۔ وہ انہیں ایک دوسرے کے بھائی کہہ کر پکارتا ہے۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ...... (۳/۱۰۳)" اس نے تمہیں اپنی نوازش کریمانہ سے باہمی بھائی بھائی بنا دیا"۔ یعنی جو لوگ نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی اعتبار سے ایک تھے وہ ایمان کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن قرار پا گئے اور جو ان تمام

اعتبارات میں ایک دوسرے سے الگ تھے وہ محض ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ ابوجہل اور عمرؓ نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، ہر لحاظ سے ایک تھے۔ لیکن جب عمرؓ ایمان لے آئے تو اُن کے باہمی تمام رشتے منقطع ہو گئے۔ اور بلالؓ، عمرؓ کا بھائی بن گیا جو ان تمام اعتبارات کی رو سے عمرؓ سے مختلف تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلام میں وجہِ جامعیت مذہب (ایمان) اور صرف مذہب ہے۔ نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، خون، رنگ کا کوئی اشتراک نہیں۔ وَذَالِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ...

(۰)

(۲) قائدِ اعظمؒ اور بنائے قومیّت

قائدِ اعظمؒ نے اِس حقیقت کو چند الفاظ میں اِس جامعیت سے بیان کر دیا کہ جوں جوں انسان اُن پر غور کرتا ہے اس کی فکر وجد میں آجاتی ہے۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو، علی گڑھ یونیورسٹی میں، ایک تقریر کے دوران کہا تھا:۔

پاکستان کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ جب اُس غیر مسلم نے اسلام اختیار کیا تھا تو اُس نے اپنے نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی رشتوں کو نہیں بدلا تھا۔ وہ تو بدستور موجود تھے۔ اُس نے صرف مذہب کو بدلا تھا۔ اور اس تبدیلی (اور صرف اس تبدیلی) کی بنا پر وہ پاکستان کی پہلی اینٹ قرار پا گیا تھا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ نے مسلم قومیت کی بنا کس چیز کو قرار دیا تھا! صرف مذہب کو!

مسٹر گاندھی نے (خود فریبی یا ابلہ فریبی) کی بنا پر اعتراض کیا تھا کہ

> میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب، چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی نے کہا تھا کہ جن لوگوں نے مذہب تبدیل کیا تھا اُن کے نسلی، ثقافتی، وطنی ناتے تو بدستور غیر مسلموں کے ساتھ پیوستہ تھے۔ تبدیلی محض مذہب کی تھی، تو مذہب کو تشکیلِ قومیت سے کیا واسطہ کہ محض اس کی تبدیلی سے ان کی قومیت تبدیل ہو گئی!؛ سنیئے کہ قائدِ اعظمؒ نے اس سلسلہ میں مسٹر گاندھی سے کیا کہا تھا۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا:۔

> آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن آپ سے جب سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوتِ محرکہ

> ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان کے معاملات سے واسطہ نہ ہو میں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ (جناح کا خط بنام گاندھی۔ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء)

آپ نے غور فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ نے مسٹر گاندھی کے اس اعتراض کا جواب ہی نہیں دیا۔ (کہ مذہب تشکیلِ قومیت کی بنا نہیں ہوسکتا) بلکہ یہ بھی واضح کر دیا کہ اسلام کی رو سے تمام امورِ حیات کی بنا مذہب ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مقالہ —— کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟ —— (مطبوعہ طلوعِ اسلام۔ دسمبر سنہ ۱۹۷۶ء و نوائے وقت مورخہ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء)۔ اس سے یہ فطری نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا مذہب دوسروں سے مختلف ہوگا تو ان کی ثقافت، تمدن، معاشرت، سیاست سب دوسروں سے مختلف اور منفرد ہوں گے کیونکہ اُن کے مذہب کی اصل کی شاخیں ہوں گی۔ اسی بنا پر قائدِ اعظمؒ نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا تمدن و ثقافت وغیرہ بھی دوسروں سے مختلف ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں تھی کہ ان کی قومیت کی بنیاد، مذہب کو چھوڑ کر ان کا تمدن یا ثقافت تھی۔ انہوں نے اس خط میں یہاں تک کہ دیا تھا کہ اگر مذہب نہ رہے تو وہ زندگی انسانی نہیں، محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ خیزی رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(۳) دوسری قوموں کا غم!

پروفیسر صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ اگر اسلام کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ قومیت کی بنا اشتراکِ ایمان ہے تو دنیا کی ان قوموں کا کیا بنے گا جو ایک مذہب (عیسائیت) رکھنے کے باوجود دیگر عناصر (نسل وطن وغیرہ) کی بنا پر اپنا مختلف قومی تشخص رکھتی ہیں۔ یقین مانیئے! ایک پڑھے لکھے شخص کی طرف سے اس قدر عامیانہ اعتراض دیکھ کر ہمیں بڑا افسوس ہوا۔

اسلام ہر شعبۂ حیات کے متعلق اپنے مخصوص اور منفرد اصول رکھتا ہے۔ اگر ہم ان اصولوں کو اپنا نظامِ حیات قرار دیتے ہیں تو ان کا اطلاق ان اصولوں کو ماننے والے (مسلمانوں) پر ہوگا۔ غیروں کو اختیار ہوگا کہ وہ جی چاہے تو ان اصولوں کو اپنے ہاں رائج کر لیں، اور جی چاہے تو اپنے مروجہ اصولوں پر کاربند رہیں۔ اگر وہ نسلی یا وطنی اشتراک کو بنائے قومیت قرار دیتے ہیں تو دیتے رہیں۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ہم اپنے ہاں اسے بنائے قومیت قرار نہیں دیں گے۔ ہماری قومیت کی تشکیل اشتراکِ مذہب کی بنا پر ہی ہوگی۔

(ضمناً) پروفیسر صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب تو اقوامِ مغرب کے دانشور بھی اپنے ہاں کی بنائے قومیت کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہیں اور کسی متبادل بنائے قومیت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہم

انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ نیشنلزم کے موضوع پر دانشورانِ مغرب کے حالیہ خیالات کا مطالعہ فرمائیں۔ وہ تو اپنے ہاں کی قومیتوں سے اس قدر تنگ آ چکے ہیں اور ہمارے مقالہ نگار اس غم میں نڈھال ہو رہے ہیں کہ اگر ہم نے مذہب کو بناءِ قومیت تسلیم کر لیا تو اقوامِ مغرب کا کیا بنے گا!

اب آیئے مسلمان قوموں کی طرف۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے ایمان کا اشتراک بناءِ قومیت ہے یا نہیں۔ اگر یہ بناءِ قومیت ہے تو کسی اور عنصر (وطن، نسل، زبان، رنگ) کو بناءِ قومیت قرار دینا خلافِ اسلام ہے۔ اگر مسلمان نام رکھنے والی قومیں ایسا کرتی ہیں تو ان کا یہ عمل اسلام کے خلاف ہوگا۔ لیکن پروفیسر صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ اگر یہ اصول (کہ مذہب بناءِ قومیت ہے) صحیح بھی ہے تو بھی ہمیں اسے اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہیئے کہ اس سے موجودہ مسلمان قوموں کا تشخص باقی نہیں رہے گا۔ گویا ہمیں ایک اسلامی اصول کو اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہیئے کہ اس سے غیر اسلامی اصولوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ کیسی دلچسپ ہے یہ منطق!

اسلام کا منتہیٰ، وحدتِ انسانیت ہے۔ اس کے لئے وہ بطورِ قدمِ اوّل ایسی قوم تیار کرتا ہے جو نسل، رنگ، زبان، وطن کی حدود سے بلند ہو کر خالص ایمان کے اشتراک سے وجود میں آئے۔ اس نے ایسی ہی اُمّت تیار کی تھی۔ صدرِ اوّل کے مسلمانوں میں صرف اُمّتِ مسلمہ کا وجود تھا۔ مصری، شامی، عراقی، حجازی، مسلمان قوموں کا وجود نہیں تھا۔ ان قومیتوں کا وجود اُس زمانے میں عمل میں آیا جب ہماری گاڑی اسلام کی پٹڑی سے الگ ہو گئی۔ جب اسلام دوبارہ نافذالعمل ہوگا تو یہ جاہلیہ کے تشخصات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ علامہ اقبالؒ (جنہوں نے اس بناءِ قومیت کا تصور دیا تھا) کے پیشِ نظر یہی تھا۔ انہوں نے ۲۲-۱۹۲۱ء میں کہا تھا ؎

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا | نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی (بانگِ درا)

اور ؎

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی | تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا (")
غبارِ آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے | تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا (")

نیز ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے | نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر (")
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا | ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر! (")
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدّم ہو گئی | اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر (")

اور زندگی کے آخری دور میں ؎

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک | ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے (بالِ جبریل)

وحدتِ اُمّت کے اسی قرآنی تصوّر کو بیک عطا کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر دیا تھا، جس میں اب ہماری نئی نسل کی ذہنیتوں کے معمار (اساتذہ) انہیں یہ سبق پڑھا رہے ہیں کہ اگر اس نظریّہ کو اپنایا گیا تو

افغانی، تورانی، خراسانی کا کیا بنے گا؟ اِس لئے خیر اسی میں ہے کہ اس قوم پر غیر اسلامی نظریات مسلط رہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر کلاس میں کبھی علامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا اشعار سامنے ہوں گے تو فتح نصیب صاحب اپنے شاگردوں سے کہتے ہوں گے کہ اقبالؒ مسلمانوں کو غلط سبق پڑھا گئے ہیں؟

———(۰)———

(۴) ثقافتی ورثہ

تحریکِ پاکستان کے دوران مخالفین کی طرف سے) اشتراکِ وطن ہی کو وجہِ جامعیت قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن پاکستان میں آکر جغرافیائی اشتراک کے علاوہ، ایک اور تصوّر "ثقافتی ورثہ" کا بھی وجود پذیر ہو گیا۔ اگرچہ ثقافت کے متعلق آج تک کسی نے نہیں بتایا کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے؛ یہ ایک بڑی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ اس کے پیچھے دو جذبات کارفرما ہیں۔ مسٹر گاندھی نے یہ کہا تھا کہ اگر کچھ ہندو تبدیلیٔ مذہب سے مسلمان ہو جاتے ہیں تو وہ صرف اپنا مذہب بدلتے ہیں۔ وہ ثقافت (کلچر) جو اُن میں ورثتاً چلا آرہا ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس ورثہ کی بنا پر وہ اپنی سابقہ قومیت کے افراد قرار پاتے ہیں۔ یہ سازش ابھی تک رینگتی، سلگتی، پاکستان کی طرف آتی رہی ہے۔ غیر ملکی سیّاح پہلے ہندوستان جاتے ہیں اور وہاں سے پاکستان آتے ہیں۔ وہ دونوں ملکوں میں موسیقی، رقص، ڈرامے، وغیرہ دیکھنے کے بعد یہ تاثر دے جاتے ہیں کہ اس ثقافتی ورثہ میں ہم نے ان دونوں ملکوں میں کوئی فرق نہیں دیکھا۔ اس لئے یہاں کا مسلمان اور وہاں کا ہندو اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے۔ ان میں تفرقہ صرف سیاسی مفادات کا پیدا کردہ ہے۔

کچھ قوموں کو خطرہ لاحق ہوا کہ پاکستان اگر اسلام کے نام پر نہ سہی وطن کی بنا پر بھی ایک ملک اور ایک قوم کی حیثیت سے قائم رہ گیا تو ان کے لئے وجہِ دردِ سر رہے گا۔ اس کے ازالہ کے لئے کچھ عرصہ ہوا روس سے ایک مؤرّخ تشریف لائے جنہوں نے (NATIONALITIES IN PAKISTAN) کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس میں انہوں نے اس نظریہ کو اُجاگر کیا تھا کہ قومیت کی بنا ثقافت ہوتی ہے۔ اور پاکستان کے مختلف صوبوں کی ثقافت الگ الگ ہے۔ اس لئے یہاں ایک (پاکستانی) قوم نہیں بستی۔ چار (صوبوں کی) مختلف قومیں آباد ہیں۔ اس نظریہ کو فیض اور جوشؔ جیسے قلمکاروں نے ہی نہیں مسٹر بزنجو اور مینگل جیسے سیاستدانوں نے بھی خوب اچھالا تھا۔ اب چودھری فتح نصیب صاحب بھی فرما رہے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں ثقافتی ورثہ کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ؏

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں! (بالِ جبریل)

(۵) قوم نہیں اُمّت!

مقالہ نگار کا اگلا اعتراض یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو اُمّت قرار دیا ہے۔ قوم نہیں۔ اِس لئے وہ

مذہب کے اشتراک سے ایک اُمّت تو بن سکتے ہیں۔ قوم نہیں بن سکتے۔

اس سے ہمیں وہ معرکہ یاد آگیا جو تحریکِ پاکستان کے دوران (مولانا) حسین احمد (مدنی) اور علامہ اقبالؒ میں برپا ہوا تھا۔ مولانا مرحوم نے اپنی تقریر میں کہا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس پر علامہ مرحوم تڑپ اٹھے اور انہوں نے اپنے بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے یہ اشعار فضا میں پھیلا دیئے کہ ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ؛ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است (ارمغانِ حجاز)
سرود برسرِ منبر کہ ملّت از وطن است ؛ چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است ! (۵)

مولانا مرحوم نے اس کے جواب میں ایک لمبا چوڑا بیان شائع فرمایا جس میں سارا زور اس نکتہ پر صرف کیا گیا تھا کہ میں نے اپنی تقریر میں "قوم" کہا تھا "ملّت" نہیں کہا تھا۔ اقبالؒ نے میرے بیان میں تحریف کی ہے اور پھر ملّت اور قوم کے لغوی معانی پر وہ بحث شروع کر دی تھی جس کا نفسِ موضوع سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرتِ علامہ نے اپنے جواب میں کہا تھا کہ ؎

قلندر جُز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا ؛ فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا (بالِ جبریل)

اسی کی صدائے بازگشت فتح نصیب صاحب کے مقالہ میں سنائی دیتی ہے۔ جہاں وہ لکھتے ہیں کہ قرآن نے مسلمانوں کے لئے اُمّت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قوم کا نہیں۔ اور "اُمّت" اور "قوم" کے لغوی معانی میں بڑا فرق ہے۔

یہ صاحب سیاسیات کے اُستاد ہیں اس لئے ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے کہ جب کوئی لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے تو اُس کے لغوی معنی نہیں لئے جاتے۔ اصطلاحی مفہوم لیا جاتا ہے اور اُن میں اکثر بڑا فرق ہوتا ہے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ لفظ قوم یا نیشن نے جو سیاسی مفہوم آجکل اختیار کر رکھا ہے زمانہ نزولِ قرآن کے عرب معاشرہ میں اس کا تصور تک نہیں تھا۔ وہ لوگ اس لفظ (قوم) کو ان معنوں میں استعمال کرتے تھے جن معنوں میں ہم لفظ "لوگ" استعمال کرتے ہیں۔ (وہ تو بلکہ اس میں عورتوں کو بھی شامل نہیں کیا کرتے تھے) قرآنِ کریم نے (مثلاً) جب قَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ... (۶/۱۴۷) کہا تو اس کے معنی وہ لوگ تھے جو جرائم کے مرتکب ہوتے تھے۔ اس نے جب لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ .... (۴۵/۵) کہا تو اس سے مراد وہ لوگ تھے جو عقل و فکر سے کام لیں۔ اس نے جب مختلف انبیاء کی اقوام کا ذکر کیا تو اس سے مراد وہ لوگ لئے جن کی طرف وہ انبیاء مبعوث ہوئے تھے یا جن میں وہ رہتے سہتے تھے۔ ان آیات میں لفظِ قوم سے مراد آج کل کی سیاسی اصطلاح کی نیشن نہیں تھی۔

علامہ اقبالؒ کو ایک دفعہ اور بھی اسی قسم کے الجھاؤ سے واسطہ پڑا تھا۔ وطن پرست (نیشنلسٹ) طبقہ نے کہیں سے عربی کا ایک فقرہ ــــ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ ــــ سن لیا اور اُسے حدیثِ نبویؐ کہہ کر یہ دعویٰ کر دیا کہ حب الوطنی (PATRIOTISM) ایمان کا جزو ہے۔ علامہ اقبالؒ نے یہ سنا تو کہا کہ اوّل تو یہ فقرہ حدیثِ نبویؐ ہے ہی نہیں اور اگر اس کی کچھ حقیقت ہے بھی تو

اس میں وطن سے مراد محض جائے سکونت ہے۔ وہ سیاسی مفہوم نہیں جو اس سے آجکل لیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے انہوں نے اپنی مشہور نظم (وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) میں کہا تھا کہ

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے (بانگِ درا)

گفتارِ سیاست میں "وطن" وہ ہے کہ .... "جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے"

سوال یہ ہے کہ آج کل کی اصطلاح میں قومیت کی جو بنیاد ہے کیا وہ اسلام کے مطابق ہے۔ اور اس کا جواب دو ٹوک الفاظ میں "نفی" میں ہے۔ قرآن کی رُو سے قومیت کی بنیاد ایمان کا اشتراک ہے اور بس۔

اب رہا معترض کا یہ دعویٰ کہ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کو "اُمّت" کہا ہے، "قوم" نہیں کہا تو یہ اُن کی قرآن سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ قرآن میں جماعتِ مومنین کے لئے قوم کا لفظ بھی آیا ہے (مثلاً) سورۃ الاعراف میں ہے...... هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷/۵۲) "ہدایت و رحمت اس قوم کے لئے جو ایمان لائی ہے"۔ اس کے برعکس اس نے کفار کے لئے (عن) قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰/۱۰۱) کہا ہے وہ قوم جو ایمان نہیں لائی۔ سورۃ مجادلہ میں ان دونوں گروہوں کا تقابل بڑے بلیغ انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ فرمایا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط
اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط وَ
يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ
حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲)

تُو کبھی ایسا نہیں دیکھے گا کہ وہ قوم جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھے۔ وہ اُن لوگوں سے دوستداری کے تعلقات استوار کرے جو نظامِ خداوندی کے مخالف ہوں خواہ وہ ان کے ماں باپ، بیٹے (بیٹیاں)، بھائی بند یا اُن کے خاندان کے دیگر افراد ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ افراد مومنین وہ لوگ ہیں کہ ایمان جن کے دل کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے اور خدا کی وحی کی قوت اُن کی تائید و نصرت کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔ یہ اس جنّتی معاشرہ میں داخل ہوں گے جن کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ اللہ اُن سے راضی ہو گیا وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

یہ ہے خدا کی پارٹی۔ یاد رکھو! آخر الامر کامیابی اور کامرانی خدا کی پارٹی ہی کو نصیب ہو گی۔

یہاں دیکھئے مومنین کو قوم کہا گیا ہے۔ انہوں نے ان لوگوں سے تعلقات منقطع کر لئے جو اگرچہ نسلی، لسانی، ثقافتی، خاندانی اعتبار سے ان میں شامل تھے لیکن چونکہ وہ ایمان میں ان سے الگ تھے اس لئے ان میں باہمی ایسے تعلقات نہیں تھے جو (آجکل کی اصطلاح میں) کسی قوم کے افراد میں ہوتے ہیں۔ اور سب سے

آخر یہ کہ انہیں حزب اللہ (خدا کی پارٹی) کہا گیا۔ ان کے برعکس ایمان نہ لانے والوں کو حزب الشیطان (۵۸/۲۲) انہی کو موجودہ اصطلاح میں مسلمانوں کی قوم اور غیر مسلموں کی قوم کہا جائے گا۔

اگر اُمّت اور قوم کے لفظی اختلاف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانا مقصود ہے کہ اُمّت کا لفظ مذہبی امور سے ہے اور قوم کا سیاسی امور سے، تو یہ دین اور سیاست کی وہ ثنویت ہے جو اسلام کی جڑ بنیاد کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ قرآن کی رُو سے مملکت، ایمان اور اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ... اور اس استخلاف (مملکت و حکومت) کا مقصد دین کا تمکن...... لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ (۲۴/۵۵) "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" اس مملکت کا فریضہ بنایا گیا ہے۔ (۲۲/۴۱) اور اس فریضہ کی ادائیگی، اُمّت کے سپرد کی گئی ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ...... (۳/۱۱۰)

ہم پوچھتے ہیں مقالہ نگار سے کہ موجودہ سیاست کی رُو سے .... قوم کا وجود اور کاہے کے لئے ہوتا ہے؟ سو اگر قوم کا فریضہ وہی ہوتا ہے جسے قرآن نے اُمّت کا فریضہ قرار دیا ہے تو پھر اس سے فرق کیا پڑتا ہے کہ قرآن نے جماعتِ مومنین کے لئے اُمّت کا لفظ استعمال کیا ہے، قوم کا نہیں (اگرچہ اس نے قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے)

قرآن نے اُمّت کے لفظ کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ لغت کی رُو سے بھی اس میں دین اور جماعت دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ یعنی دین کی بنیادوں پر متشکل اور دین کے مقاصد کو پورا کرنے والی جماعت کو اُمّت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا خود اس لفظ سے بھی ان تمام اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے جو مقالہ نگار نے اپنی سطح بینی کی بنا پر اُٹھائے ہیں۔

اس سے زیادہ ہم پروفیسر صاحب اور ان کے ہم نواؤں سے کیا کہیں گے کہ ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!
(ضربِ کلیم)

مغربی نظامِ تعلیم نے ہماری قوم کے ذہنوں میں کتنے بت خانے تعمیر کر رکھے ہیں؟

خریدار صاحبان متوجہ ہوں!

۱۔ بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو۔

۲۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)